

اُردو ذُلوٰب اور شاعری

ازہ آفتاب احمد خاں ایم۔ اے (انگلش و اُردو)
معرفت: جمید یہ کلینک، ذُلوٰب کا چوراہہ۔ بے پورہ ۳۰۲۰۳۔

مغل عہدِ حکومت میں جب ہمارے ملک نے سیاسی حیثیت سے
معنی میں ایک اکائی اور وحدت کی شکل اختیار کی تو ایک ملک کے لیے
ب واحد زبان کی ضرورت بھی محسوس ہوئی، چنانچہ ابتداً ہر صوبہ کے
سی زبان میں مسلمانوں نے اپنے عربی و فارسی الفاظ ملا کر ہر صوبہ کی
بان کو ہندی کا لقب دیا۔ آخر شاہ جہاں صاحبِ قراں کے عہد میں
اس پائے تختِ دہلی (۱۶۴۷ء) کی ہندی زبان نے سارے
نکسالی زبان کی حیثیت سے رواج پایا جو شروع میں زبانِ اُردو
ہی یعنی دارالسلطنت یا شاہی قلعہ کی زبان کہلائی لیکن بقولِ محقق
بیر برہنہ فیروز حامد حسن قادری مرحوم یہ امر تحقیق طلب ہے کہ اس زبان
لے اُردو کا لفظ کب سے اختیار کیا گیا۔ بہ البتہ یہ قیاس درست
نہ آتا ہے کہ مغلوں کے زمانہ سے ہندوستان میں اُردو کا لفظ لکھراور
لکراہ کے معنوں میں استعمال ہونا شروع ہوا تھا اسی لیے اس دور

میں بازار لشکر کو اردو کہا جاتا تھا، بہ اس سبب ”بر عظیم“ ہندوپاک کے کئی شہروں میں اس نام کے بازار تاحال موجود ہیں، اجمالی طور پر یہی اس زبان کی تاریخ ہے۔

کسی زبان کے ساتھ بطور راحت لفظ ”ادب“ بھی اس کا جزو لاینفک ہوتا ہے۔ لہذا یہاں اختصاراً لفظ ادب کی وضاحت کرنا بھی ضروری ولا بدی معلوم ہوتا ہے۔ لفظ ادب کی تاریخ مختلف ارتقائی منازل طے کرتے کرتے ہم تک پہنچی ہے۔ لفظ ادب کے قدیم ترین معنی عادت طرز عمل یا اس طریقہ کے ہیں جسے آدمی وراثت میں پائے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ لفظ ”ادب“ کا ہیضہ جمع ہے جس کے لغوی معنی خرا، ڈھنگ، عادت، طریقہ یا طرز عمل ہیں نیز یہ کہ ”ادب“، ’داب‘ کی ترقی پذیر شکل ہے۔ بعد ازاں اس لفظ کے معنوی ارتقاء کی وجہ سے علمی اور اخلاقی پہلوؤں میں اس کے معنی آسان اور نمایاں تر ہوتے گئے اور اس کا معنوی دائرہ عمدہ صوفیانہ عادات بہتر تربیت اور اچھے اخلاق وغیرہ پر محیط و محتوی ہو گئے۔ لیکن یہاں یہ بات بھی ملحوظ نظر رہے کہ پہلی صدی ہجری کے زمانے سے ہی متذکرہ مفہام، سیم کے دوش بدوش یہ لفظ معلمانہ اور متعلمانہ معنی پر بھی دلالت کرتا تھا لیکن رفتہ رفتہ اس معنی پر اس کی گرفت کمزور پڑتی گئی اور جہاں تک اس کے معنوی ارتقاء کا تعلق ہے تو اس نے فرانسیسی لفظ ”لٹریچر“، جس کا اطلاق ہر اس لفظ پر ہوتا ہے جو زبان کے حدود کے اندر فکر عمیق اور نگاہ حساس کے نتیجہ میں تحریر کی جائے، کہ معنی پلٹے۔ بہر سو اس کے مجموعی معنی ہوئے عمدہ عادات و اطوار، فصاحت و بلاغت، تنقید و تبصرہ اور اشعار و انساب وغیرہ۔ بر اعتبار

مارچ ۹۱ء

۲۵

پہلی

مذکورہ معنی ادیب کی تعریف یہ کی جاسکتی ہے کہ وہ وہ شخص جس میں نیک خصلتیں جمع ہوں وہی ادیب یعنی ادب جاننے والا ہے۔“

ادب ان کتابوں اور صرف ان کتابوں پر مشتمل ہے جو اول تو اپنے موضوع اور سیرایہ بیان کے لحاظ سے عام انسانی مذاق کے موافق ہوں اور دوسرے یہ کہ ان میں زبان و بیان کی لطافتوں کو اصل الاصول قرار دیا گیا ہو۔ ایک ادبی شے پارہ علم ہیئت، معاشیات، فلسفہ یا تاریخ کے مضامین سے اس وجہ سے مختلف ہوتا ہے کہ وہ مطالعہ کرنے والوں کے صرف ایک گروہ کو محفوظ نہیں کرتا بلکہ عام انسانوں کو سرور و نشاط بخشتا ہے دوسرے اس سبب سے بھی کہ علم ہیئت یا تاریخ وغیرہ کا کام علمیت میں اضافہ کرنا ہے افساد کا کام یہ ہے کہ خواہ معلومات میں ترقی ہو یا نہ ہو لیکن وہ جس سیرایہ بیان میں موضوع پیش کرتا ہے وہ اس قدر دلچسپ ہو کہ انسان کی جمالیاتی (Aesthetic) تشنگی دود ہو جائے اور سامع یا قاری یہ سن کر اور پڑھ کر یہ محسوس کرے کہ :

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

بالفاظ دیگر انسانی زندگی کی تفسیر ہے اور قدرت نے انسان میں سرمدی اشیاء کو ودیعت کیا ہے ان ہی کے اظہار کو ادب لطیف کہا جاتا ہے۔

کسی بھی زبان کی ترویج و ترقی کا انحصار اس قاعدہ کلیہ پر ہے کہ وہ خواص کے ساتھ ساتھ عوام پسند بھی ہو، اپنے، بیگانے، جانے بچانے سب ہی اس کے دلدادہ ہوں، دنیا کی دیگر زبانوں کے مقابلہ میں اگرچہ

اردو زبان کی عمر جیسا کہ ششہ سطور میں گذرا، کچھ زبان طویل نہیں پھر بھی یہ زبان اپنی لچک، شیرینی، لطافت و نزاکت اور ربط باہم کے سبب انگریزی کے بعد دنیا کی تمام زبانوں میں ممتاز مقام رکھتی ہے۔ علاوہ بریں کسی بھی زبان کے ادبی شہ پاروں سے اس کا تصنیفی سرمایہ بھی کچھ کم نہیں چونکہ یہ زبان ہندوستان میں ہی پیدا ہوئی لہذا یہاں کے ہر مکاتبہ فکر کے لوگوں نے اس کے نقش و نگار سنوارنے، بنانے میں اپنا اپنا خونِ جگر اور سوزِ دماغ یکساں طور پر صرف کیا ہے اس لیے اس زبان کو ہندوستانی کہنے پر ہمیں سچا طور پر فخر ہے۔ اس نے ہندوستانی ماحول میں ترقی کی اور اس کی ترقی میں دونوں مذاہب کے لوگوں کا برابر تعاون رہا۔ اردو زبان و شاعری نے ہندوستانی ماحول، دیو مالاؤں اور موضوع کے اعتبار سے ہندوستان کی ہر خیز کو اپنایا اس وجہ سے اس زبان میں وسعت پیدا ہوئی اور یہ ایک شتر کہ گنگا جمنی تہذیب کی علامت بن گئی۔

اردو شاعری کے اصناف سخن میں غزل سب سے مقبول ترین صنف ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کی پشت پر زندگی کے ارتقاء کی طویل کہانی ہے اس میں تمدنی وراثت اور تہذیبی اخراجات کے اجزاء خصوصی کی جلوہ گری و کار فرمائی بدرجہ اتم دکھائی دیتی ہے۔ اردو غزل کا پنج گھر میں چھوٹی موٹی کی طرح دنیا سے الگ تھلک نہیں رہی بلکہ اس میں ایک سماجی احساس اور حیاتِ انسانی کے تقاضوں کا بھرپور سامان موجود ہے۔ صوفی فلسفہ اور دشن کے امتزاج و آیزش کے سبب اس میں نہایت اعلیٰ موضوعات کا اظہار اور میان ہوا ہے مثلاً

نہیں سچ بتاؤ کون تھا شیریں کے پیکر میں
 کہ دشتِ خاک کی حسرت میں کوئی کوہکن کیوں ہو
 خواجہ میر دردؒ اور حضرت مرزا مظہر جانِ خاں علیہ الرحمہ جیسے عظیم
 صوفی شاعرانے اس میں سارے زلمے کے درد و احساسات کی ایک وسیع
 وعریفی اور عرفی اور نئی دنیا سمجھ دی ہے۔ چنانچہ اس بات کو ملحوظ خاطر
 رکھتے ہوئے اتیر مینائی نے بجا طور پر فرمایا ہے کہ ۵
 فخر چلے کسی پہ ترپتے ہیں ہم امیر
 سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے
 دوسری طرف غالب و مومن نے اسے کائنات کی وسیع وعریفی فضاؤں
 اور بیض فضاؤں سے پرے پہنچا دیا ہے۔ ۵

منزل اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
 عرش سے پرے ہوتا کاش کہ مکاں اپنا (غالب)
 یا ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
 ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقش پا پایا (غالب)
 غزل ہمارے یہاں سب سے زیادہ مقبول صنفِ شاعری اس
 لئے ہے کہ وہ ہمارے دل اور سہج کی جو رو داد ہے اسے بوری و فداوی
 اور شدت کے ساتھ بیان کرتی ہے۔ چنانچہ اگر یہ کہا جائے کہ غزلِ اردو
 شاعری کی صنوف میں مستحکم ترین صنف ہے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ کیونکہ اس کی
 پشت پر صدیوں کی صنائعِ انوار کی فتوحات اور گراں قدر تخلیقات کے
 طویل اور زریں سلسلے ہیں جو ماضی میں دور تک چلے گئے ہیں یہی وجہ ہے کہ
 غزل اپنے بنیادی و رمزیاتی اسلوب کی مداوت کے باوجود ہر دور میں بلکہ

ہر بڑے شاعر کے کلام میں اک نئی آن بان کے ساتھ جلوہ گر ہوتی رہی ہے۔
 بیان اور ابلاغ و ترسیل کی لاکھوں نزاکتوں اور بے شمار لطافتوں سے اس
 کا دامن بھر پور ہے۔ افکار و تأملات، احساسات و انفعالات، حقائق و
 بفسائر اور اسالیب و صورت کے اس حیرت انگیز طلسم خانے کا جواب فارسی
 کے علاوہ دنیا کی شاید ہی کوئی دوسری زبان اور شاید ہی کوئی دوسرا ادب
 ہو جو پیش کرنے کی جرأت کر سکے۔ اردو شاعری، علی الخصوص غزل میں
 زبان و بیان کی فصاحت اور سادگی، سوز و گداز نیز مضامین کی تاثیر و
 جدت اور تخیل کی ندرت، ایسی خوبیاں ہیں جو کسی زبان کو شاید و باید
 ہی نصیب ہوں۔ اردو شاعری کا ہر لفظ گنجینہء معنی کا طلسم کہا جاسکتا
 ہے۔ بقول غالب: ہے

گنجینہء معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
 جو لفظ کہ غالب سرے اشعار میں آئے

یہ قول نہ صرف غالب بلکہ پوری اردو پر صادق آتا ہے جس تغزل کی
 شاعری گنجینہء معنی کا بہترین نمونہ ہے، جس ایجاز و اختصار کے ساتھ
 غزل کے کسی ایک شعر میں بڑے سے بڑے مسئلے پر اظہارِ خیال کیا جاسکتا
 ہے۔ فارسی کے علاوہ کسی دوسری زبان میں ممکن نہیں۔ نہ صرف ادبی
 مجالس بلکہ سیاسی و سماجی اجتماعات حتیٰ کہ پارلیمنٹ کے خشک مباحث
 تک میں تاثیر اور دلنشینی پیدا کرنے کے لیے اردو شاعری کے غزل کے
 اشعار سے کام لیا جاتا ہے، سینما، ٹھیٹر نیز دیگر تفریحی اور کچھل پرگھڑوں
 کی تو اردو شاعری گویا جان اور جزع لا ینفک ہے۔ جنگ آزادی میں اس
 کے حمایتیاں کردار اور اہم رول ادا کرنے کے سلسلے میں یہاں کچھ عرض کرنا

ماہ ۹۱ء

۲۹

برہنہ علی

نظریں کا سبب ہو گا کہ یہ موضوع ایک علیحدہ مقالہ کا متقاضی ہے۔ البتہ
انتہائی ضروری خیال کرتا ہوں کہ:

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے
جیسے پنکڑوں اشعار نے غمیف و تانواں لوگوں میں قوت و توانائی اور
مردہ دلوں میں یہ کہہ کر روح بھونک دی تھی:

زندگی زندہ دلی کا نام ہے
مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

اور یہ کہ

یہ مصرع کاش نقش ہر در و دیوار ہو جائے

جسے جینا ہو مرنے کے لئے تیار ہو جائے

اُردو شاعری میں اضافت کی مدد سے تشبیہوں، استعاروں اور
لفظی تصویروں کا جو آئینہ خانہ بنایا گیا ہے، اس کی مثال دوسری
زبانوں کی شاعری میں ذرا مشکل سے ملے گی۔ اس سلسلہ میں اُردو فارسی
کے دوش بدوش ہے اور کبھی آگے بھی بڑھ جاتی ہے۔

روایت پسندی اور بعض زوال پذیر رسوم و عادات کے باوجود،
جوار و شاعری میں دلستان لکھنؤ کے اثرات سے مروج ہوئیں، محض رخ
و رخسار اور زلف محبوب کی کہانی نہیں بلکہ اس کے برعکس اُردو زبان و
ادب کے بڑے غزل گو شعراء نے زندگی کا ساتھ دیا ہے اور ہر ایک نے
اپنے لافانی اشعار میں سیاسی و معاشرتی، تہذیبی و تمدنی اور فاجی و
اندرونی مسائل کو جذب کیا ہے۔ اگر ہم اُردو شاعری کے ارتقائی مراحل

کالتقابل مطالعہ کریں معلوم ہوگا نسبتاً آج وہ ترقی کی کتنی منزلیں طے کر چکی ہے اور گل و بلبل، لب و رخسار اور خال محبوب سے کتنی دور پہنچ گئی ہے۔ اس وضاحت کے بعد اس اعتراض کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ اردو شاعری میں اخلاقی بلندی کی تعلیم نہیں ہوتی بلکہ یہ بستی سکھلاتی ہے، حالانکہ شاعری تہذیب اخلاق کا بڑا ذریعہ ہے لیکن اول تو ہر شاعر ریفارمر اور مصلح نہیں ہوتا اور نہ ایسا ہونا ضروری ہے، دوسرے ہمیں یہ تسلیم کہ ہر اردو شاعر نے اصلاح اخلاق کو مستقل موضوع سخن نہیں بنایا۔ لیکن اس کے علی الرغم اُن کے دواوین اخلاقی عناصر، گرمی حیات، سور و گداز، اخوت و مساوات اور انسانی ہمدردی وغیرہ امور سے خالی بھی نہیں اگر سطحی نظر سے بھی اُن کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں اُن کے کلام میں اصلاح اخلاق کی بلندیاں نمایاں طور پر دکھائی دیں گی۔ مثلاً حفیظ جالندھری اپنے احباب کی دنی فطرت کی اصلاح کتنے پیرایہ میں کرنا چاہتے ہیں:

دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

یا پھر

اُن کو دے آئے ہیں خود اپنی محبت کے خطوط
غمگساروں کی ذرا نامہ بری تو دیکھو

دراصل اردو شاعری نے حیات انسانی کے ہر موڑ پر اس کی ترجمانی کی ہے اور اُس کا ساتھ دیا ہے۔ ^۱ ^۲ ^۳ ^۴ ^۵ ^۶ ^۷ ^۸ ^۹ ^{۱۰} ^{۱۱} ^{۱۲} ^{۱۳} ^{۱۴} ^{۱۵} ^{۱۶} ^{۱۷} ^{۱۸} ^{۱۹} ^{۲۰} ^{۲۱} ^{۲۲} ^{۲۳} ^{۲۴} ^{۲۵} ^{۲۶} ^{۲۷} ^{۲۸} ^{۲۹} ^{۳۰} ^{۳۱} ^{۳۲} ^{۳۳} ^{۳۴} ^{۳۵} ^{۳۶} ^{۳۷} ^{۳۸} ^{۳۹} ^{۴۰} ^{۴۱} ^{۴۲} ^{۴۳} ^{۴۴} ^{۴۵} ^{۴۶} ^{۴۷} ^{۴۸} ^{۴۹} ^{۵۰} ^{۵۱} ^{۵۲} ^{۵۳} ^{۵۴} ^{۵۵} ^{۵۶} ^{۵۷} ^{۵۸} ^{۵۹} ^{۶۰} ^{۶۱} ^{۶۲} ^{۶۳} ^{۶۴} ^{۶۵} ^{۶۶} ^{۶۷} ^{۶۸} ^{۶۹} ^{۷۰} ^{۷۱} ^{۷۲} ^{۷۳} ^{۷۴} ^{۷۵} ^{۷۶} ^{۷۷} ^{۷۸} ^{۷۹} ^{۸۰} ^{۸۱} ^{۸۲} ^{۸۳} ^{۸۴} ^{۸۵} ^{۸۶} ^{۸۷} ^{۸۸} ^{۸۹} ^{۹۰} ^{۹۱} ^{۹۲} ^{۹۳} ^{۹۴} ^{۹۵} ^{۹۶} ^{۹۷} ^{۹۸} ^{۹۹} ^{۱۰۰} ^{۱۰۱} ^{۱۰۲} ^{۱۰۳} ^{۱۰۴} ^{۱۰۵} ^{۱۰۶} ^{۱۰۷} ^{۱۰۸} ^{۱۰۹} ^{۱۱۰} ^{۱۱۱} ^{۱۱۲} ^{۱۱۳} ^{۱۱۴} ^{۱۱۵} ^{۱۱۶} ^{۱۱۷} ^{۱۱۸} ^{۱۱۹} ^{۱۲۰} ^{۱۲۱} ^{۱۲۲} ^{۱۲۳} ^{۱۲۴} ^{۱۲۵} ^{۱۲۶} ^{۱۲۷} ^{۱۲۸} ^{۱۲۹} ^{۱۳۰} ^{۱۳۱} ^{۱۳۲} ^{۱۳۳} ^{۱۳۴} ^{۱۳۵} ^{۱۳۶} ^{۱۳۷} ^{۱۳۸} ^{۱۳۹} ^{۱۴۰} ^{۱۴۱} ^{۱۴۲} ^{۱۴۳} ^{۱۴۴} ^{۱۴۵} ^{۱۴۶} ^{۱۴۷} ^{۱۴۸} ^{۱۴۹} ^{۱۵۰} ^{۱۵۱} ^{۱۵۲} ^{۱۵۳} ^{۱۵۴} ^{۱۵۵} ^{۱۵۶} ^{۱۵۷} ^{۱۵۸} ^{۱۵۹} ^{۱۶۰} ^{۱۶۱} ^{۱۶۲} ^{۱۶۳} ^{۱۶۴} ^{۱۶۵} ^{۱۶۶} ^{۱۶۷} ^{۱۶۸} ^{۱۶۹} ^{۱۷۰} ^{۱۷۱} ^{۱۷۲} ^{۱۷۳} ^{۱۷۴} ^{۱۷۵} ^{۱۷۶} ^{۱۷۷} ^{۱۷۸} ^{۱۷۹} ^{۱۸۰} ^{۱۸۱} ^{۱۸۲} ^{۱۸۳} ^{۱۸۴} ^{۱۸۵} ^{۱۸۶} ^{۱۸۷} ^{۱۸۸} ^{۱۸۹} ^{۱۹۰} ^{۱۹۱} ^{۱۹۲} ^{۱۹۳} ^{۱۹۴} ^{۱۹۵} ^{۱۹۶} ^{۱۹۷} ^{۱۹۸} ^{۱۹۹} ^{۲۰۰} ^{۲۰۱} ^{۲۰۲} ^{۲۰۳} ^{۲۰۴} ^{۲۰۵} ^{۲۰۶} ^{۲۰۷} ^{۲۰۸} ^{۲۰۹} ^{۲۱۰} ^{۲۱۱} ^{۲۱۲} ^{۲۱۳} ^{۲۱۴} ^{۲۱۵} ^{۲۱۶} ^{۲۱۷} ^{۲۱۸} ^{۲۱۹} ^{۲۲۰} ^{۲۲۱} ^{۲۲۲} ^{۲۲۳} ^{۲۲۴} ^{۲۲۵} ^{۲۲۶} ^{۲۲۷} ^{۲۲۸} ^{۲۲۹} ^{۲۳۰} ^{۲۳۱} ^{۲۳۲} ^{۲۳۳} ^{۲۳۴} ^{۲۳۵} ^{۲۳۶} ^{۲۳۷} ^{۲۳۸} ^{۲۳۹} ^{۲۴۰} ^{۲۴۱} ^{۲۴۲} ^{۲۴۳} ^{۲۴۴} ^{۲۴۵} ^{۲۴۶} ^{۲۴۷} ^{۲۴۸} ^{۲۴۹} ^{۲۵۰} ^{۲۵۱} ^{۲۵۲} ^{۲۵۳} ^{۲۵۴} ^{۲۵۵} ^{۲۵۶} ^{۲۵۷} ^{۲۵۸} ^{۲۵۹} ^{۲۶۰} ^{۲۶۱} ^{۲۶۲} ^{۲۶۳} ^{۲۶۴} ^{۲۶۵} ^{۲۶۶} ^{۲۶۷} ^{۲۶۸} ^{۲۶۹} ^{۲۷۰} ^{۲۷۱} ^{۲۷۲} ^{۲۷۳} ^{۲۷۴} ^{۲۷۵} ^{۲۷۶} ^{۲۷۷} ^{۲۷۸} ^{۲۷۹} ^{۲۸۰} ^{۲۸۱} ^{۲۸۲} ^{۲۸۳} ^{۲۸۴} ^{۲۸۵} ^{۲۸۶} ^{۲۸۷} ^{۲۸۸} ^{۲۸۹} ^{۲۹۰} ^{۲۹۱} ^{۲۹۲} ^{۲۹۳} ^{۲۹۴} ^{۲۹۵} ^{۲۹۶} ^{۲۹۷} ^{۲۹۸} ^{۲۹۹} ^{۳۰۰} ^{۳۰۱} ^{۳۰۲} ^{۳۰۳} ^{۳۰۴} ^{۳۰۵} ^{۳۰۶} ^{۳۰۷} ^{۳۰۸} ^{۳۰۹} ^{۳۱۰} ^{۳۱۱} ^{۳۱۲} ^{۳۱۳} ^{۳۱۴} ^{۳۱۵} ^{۳۱۶} ^{۳۱۷} ^{۳۱۸} ^{۳۱۹} ^{۳۲۰} ^{۳۲۱} ^{۳۲۲} ^{۳۲۳} ^{۳۲۴} ^{۳۲۵} ^{۳۲۶} ^{۳۲۷} ^{۳۲۸} ^{۳۲۹} ^{۳۳۰} ^{۳۳۱} ^{۳۳۲} ^{۳۳۳} ^{۳۳۴} ^{۳۳۵} ^{۳۳۶} ^{۳۳۷} ^{۳۳۸} ^{۳۳۹} ^{۳۴۰} ^{۳۴۱} ^{۳۴۲} ^{۳۴۳} ^{۳۴۴} ^{۳۴۵} ^{۳۴۶} ^{۳۴۷} ^{۳۴۸} ^{۳۴۹} ^{۳۵۰} ^{۳۵۱} ^{۳۵۲} ^{۳۵۳} ^{۳۵۴} ^{۳۵۵} ^{۳۵۶} ^{۳۵۷} ^{۳۵۸} ^{۳۵۹} ^{۳۶۰} ^{۳۶۱} ^{۳۶۲} ^{۳۶۳} ^{۳۶۴} ^{۳۶۵} ^{۳۶۶} ^{۳۶۷} ^{۳۶۸} ^{۳۶۹} ^{۳۷۰} ^{۳۷۱} ^{۳۷۲} ^{۳۷۳} ^{۳۷۴} ^{۳۷۵} ^{۳۷۶} ^{۳۷۷} ^{۳۷۸} ^{۳۷۹} ^{۳۸۰} ^{۳۸۱} ^{۳۸۲} ^{۳۸۳} ^{۳۸۴} ^{۳۸۵} ^{۳۸۶} ^{۳۸۷} ^{۳۸۸} ^{۳۸۹} ^{۳۹۰} ^{۳۹۱} ^{۳۹۲} ^{۳۹۳} ^{۳۹۴} ^{۳۹۵} ^{۳۹۶} ^{۳۹۷} ^{۳۹۸} ^{۳۹۹} ^{۴۰۰} ^{۴۰۱} ^{۴۰۲} ^{۴۰۳} ^{۴۰۴} ^{۴۰۵} ^{۴۰۶} ^{۴۰۷} ^{۴۰۸} ^{۴۰۹} ^{۴۱۰} ^{۴۱۱} ^{۴۱۲} ^{۴۱۳} ^{۴۱۴} ^{۴۱۵} ^{۴۱۶} ^{۴۱۷} ^{۴۱۸} ^{۴۱۹} ^{۴۲۰} ^{۴۲۱} ^{۴۲۲} ^{۴۲۳} ^{۴۲۴} ^{۴۲۵} ^{۴۲۶} ^{۴۲۷} ^{۴۲۸} ^{۴۲۹} ^{۴۳۰} ^{۴۳۱} ^{۴۳۲} ^{۴۳۳} ^{۴۳۴} ^{۴۳۵} ^{۴۳۶} ^{۴۳۷} ^{۴۳۸} ^{۴۳۹} ^{۴۴۰} ^{۴۴۱} ^{۴۴۲} ^{۴۴۳} ^{۴۴۴} ^{۴۴۵} ^{۴۴۶} ^{۴۴۷} ^{۴۴۸} ^{۴۴۹} ^{۴۵۰} ^{۴۵۱} ^{۴۵۲} ^{۴۵۳} ^{۴۵۴} ^{۴۵۵} ^{۴۵۶} ^{۴۵۷} ^{۴۵۸} ^{۴۵۹} ^{۴۶۰} ^{۴۶۱} ^{۴۶۲} ^{۴۶۳} ^{۴۶۴} ^{۴۶۵} ^{۴۶۶} ^{۴۶۷} ^{۴۶۸} ^{۴۶۹} ^{۴۷۰} ^{۴۷۱} ^{۴۷۲} ^{۴۷۳} ^{۴۷۴} ^{۴۷۵} ^{۴۷۶} ^{۴۷۷} ^{۴۷۸} ^{۴۷۹} ^{۴۸۰} ^{۴۸۱} ^{۴۸۲} ^{۴۸۳} ^{۴۸۴} ^{۴۸۵} ^{۴۸۶} ^{۴۸۷} ^{۴۸۸} ^{۴۸۹} ^{۴۹۰} ^{۴۹۱} ^{۴۹۲} ^{۴۹۳} ^{۴۹۴} ^{۴۹۵} ^{۴۹۶} ^{۴۹۷} ^{۴۹۸} ^{۴۹۹} ^{۵۰۰} ^{۵۰۱} ^{۵۰۲} ^{۵۰۳} ^{۵۰۴} ^{۵۰۵} ^{۵۰۶} ^{۵۰۷} ^{۵۰۸} ^{۵۰۹} ^{۵۱۰} ^{۵۱۱} ^{۵۱۲} ^{۵۱۳} ^{۵۱۴} ^{۵۱۵} ^{۵۱۶} ^{۵۱۷} ^{۵۱۸} ^{۵۱۹} ^{۵۲۰} ^{۵۲۱} ^{۵۲۲} ^{۵۲۳} ^{۵۲۴} ^{۵۲۵} ^{۵۲۶} ^{۵۲۷} ^{۵۲۸} ^{۵۲۹} ^{۵۳۰} ^{۵۳۱} ^{۵۳۲} ^{۵۳۳} ^{۵۳۴} ^{۵۳۵} ^{۵۳۶} ^{۵۳۷} ^{۵۳۸} ^{۵۳۹} ^{۵۴۰} ^{۵۴۱} ^{۵۴۲} ^{۵۴۳} ^{۵۴۴} ^{۵۴۵} ^{۵۴۶} ^{۵۴۷} ^{۵۴۸} ^{۵۴۹} ^{۵۵۰} ^{۵۵۱} ^{۵۵۲} ^{۵۵۳} ^{۵۵۴} ^{۵۵۵} ^{۵۵۶} ^{۵۵۷} ^{۵۵۸} ^{۵۵۹} ^{۵۶۰} ^{۵۶۱} ^{۵۶۲} ^{۵۶۳} ^{۵۶۴} ^{۵۶۵} ^{۵۶۶} ^{۵۶۷} ^{۵۶۸} ^{۵۶۹} ^{۵۷۰} ^{۵۷۱} ^{۵۷۲} ^{۵۷۳} ^{۵۷۴} ^{۵۷۵} ^{۵۷۶} ^{۵۷۷} ^{۵۷۸} ^{۵۷۹} ^{۵۸۰} ^{۵۸۱} ^{۵۸۲} ^{۵۸۳} ^{۵۸۴} ^{۵۸۵} ^{۵۸۶} ^{۵۸۷} ^{۵۸۸} ^{۵۸۹} ^{۵۹۰} ^{۵۹۱} ^{۵۹۲} ^{۵۹۳} ^{۵۹۴} ^{۵۹۵} ^{۵۹۶} ^{۵۹۷} ^{۵۹۸} ^{۵۹۹} ^{۶۰۰} ^{۶۰۱} ^{۶۰۲} ^{۶۰۳} ^{۶۰۴} ^{۶۰۵} ^{۶۰۶} ^{۶۰۷} ^{۶۰۸} ^{۶۰۹} ^{۶۱۰} ^{۶۱۱} ^{۶۱۲} ^{۶۱۳} ^{۶۱۴} ^{۶۱۵} ^{۶۱۶} ^{۶۱۷} ^{۶۱۸} ^{۶۱۹} ^{۶۲۰} ^{۶۲۱} ^{۶۲۲} ^{۶۲۳} ^{۶۲۴} ^{۶۲۵} ^{۶۲۶} ^{۶۲۷} ^{۶۲۸} ^{۶۲۹} ^{۶۳۰} ^{۶۳۱} ^{۶۳۲} ^{۶۳۳} ^{۶۳۴} ^{۶۳۵} ^{۶۳۶} ^{۶۳۷} ^{۶۳۸} ^{۶۳۹} ^{۶۴۰} ^{۶۴۱} ^{۶۴۲} ^{۶۴۳} ^{۶۴۴} ^{۶۴۵} ^{۶۴۶} ^{۶۴۷} ^{۶۴۸} ^{۶۴۹} ^{۶۵۰} ^{۶۵۱} ^{۶۵۲} ^{۶۵۳} ^{۶۵۴} ^{۶۵۵} ^{۶۵۶} ^{۶۵۷} ^{۶۵۸} ^{۶۵۹} ^{۶۶۰} ^{۶۶۱} ^{۶۶۲} ^{۶۶۳} ^{۶۶۴} ^{۶۶۵} ^{۶۶۶} ^{۶۶۷} ^{۶۶۸} ^{۶۶۹} ^{۶۷۰} ^{۶۷۱} ^{۶۷۲} ^{۶۷۳} ^{۶۷۴} ^{۶۷۵} ^{۶۷۶} ^{۶۷۷} ^{۶۷۸} ^{۶۷۹} ^{۶۸۰} ^{۶۸۱} ^{۶۸۲} ^{۶۸۳} ^{۶۸۴} ^{۶۸۵} ^{۶۸۶} ^{۶۸۷} ^{۶۸۸} ^{۶۸۹} ^{۶۹۰} ^{۶۹۱} ^{۶۹۲} ^{۶۹۳} ^{۶۹۴} ^{۶۹۵} ^{۶۹۶} ^{۶۹۷} ^{۶۹۸} ^{۶۹۹} ^{۷۰۰} ^{۷۰۱} ^{۷۰۲} ^{۷۰۳} ^{۷۰۴} ^{۷۰۵} ^{۷۰۶} ^{۷۰۷} ^{۷۰۸} ^{۷۰۹} ^{۷۱۰} ^{۷۱۱} ^{۷۱۲} ^{۷۱۳} ^{۷۱۴} ^{۷۱۵} ^{۷۱۶} ^{۷۱۷} ^{۷۱۸} ^{۷۱۹} ^{۷۲۰} ^{۷۲۱} ^{۷۲۲} ^{۷۲۳} ^{۷۲۴} ^{۷۲۵} ^{۷۲۶} ^{۷۲۷} ^{۷۲۸} ^{۷۲۹} ^{۷۳۰} ^{۷۳۱} ^{۷۳۲} ^{۷۳۳} ^{۷۳۴} ^{۷۳۵} ^{۷۳۶} ^{۷۳۷} ^{۷۳۸} ^{۷۳۹} ^{۷۴۰} ^{۷۴۱} ^{۷۴۲} ^{۷۴۳} ^{۷۴۴} ^{۷۴۵} ^{۷۴۶} ^{۷۴۷} ^{۷۴۸} ^{۷۴۹} ^{۷۵۰} ^{۷۵۱} ^{۷۵۲} ^{۷۵۳} ^{۷۵۴} ^{۷۵۵} ^{۷۵۶} ^{۷۵۷} ^{۷۵۸} ^{۷۵۹} ^{۷۶۰} ^{۷۶۱} ^{۷۶۲} ^{۷۶۳} ^{۷۶۴} ^{۷۶۵} ^{۷۶۶} ^{۷۶۷} ^{۷۶۸} ^{۷۶۹} ^{۷۷۰} ^{۷۷۱} ^{۷۷۲} ^{۷۷۳} ^{۷۷۴} ^{۷۷۵} ^{۷۷۶} ^{۷۷۷} ^{۷۷۸} ^{۷۷۹} ^{۷۸۰} ^{۷۸۱} ^{۷۸۲} ^{۷۸۳} ^{۷۸۴} ^{۷۸۵} ^{۷۸۶} ^{۷۸۷} ^{۷۸۸} ^{۷۸۹} ^{۷۹۰} ^{۷۹۱} ^{۷۹۲} ^{۷۹۳} ^{۷۹۴} ^{۷۹۵} ^{۷۹۶} ^{۷۹۷} ^{۷۹۸} ^{۷۹۹} ^{۸۰۰} ^{۸۰۱} ^{۸۰۲} ^{۸۰۳} ^{۸۰۴} ^{۸۰۵} ^{۸۰۶} ^{۸۰۷} ^{۸۰۸} ^{۸۰۹} ^{۸۱۰} ^{۸۱۱} ^{۸۱۲} ^{۸۱۳} ^{۸۱۴} ^{۸۱۵} ^{۸۱۶} ^{۸۱۷} ^{۸۱۸} ^{۸۱۹} ^{۸۲۰} ^{۸۲۱} ^{۸۲۲} ^{۸۲۳} ^{۸۲۴} ^{۸۲۵} ^{۸۲۶} ^{۸۲۷} ^{۸۲۸} ^{۸۲۹} ^{۸۳۰} ^{۸۳۱} ^{۸۳۲} ^{۸۳۳} ^{۸۳۴} ^{۸۳۵} ^{۸۳۶} ^{۸۳۷} ^{۸۳۸} ^{۸۳۹} ^{۸۴۰} ^{۸۴۱} ^{۸۴۲} ^{۸۴۳} ^{۸۴۴} ^{۸۴۵} ^{۸۴۶} ^{۸۴۷} ^{۸۴۸} ^{۸۴۹} ^{۸۵۰} ^{۸۵۱} ^{۸۵۲} ^{۸۵۳} ^{۸۵۴} ^{۸۵۵} ^{۸۵۶} ^{۸۵۷} ^{۸۵۸} ^{۸۵۹} ^{۸۶۰} ^{۸۶۱} ^{۸۶۲} ^{۸۶۳} ^{۸۶۴} ^{۸۶۵} ^{۸۶۶} ^{۸۶۷} ^{۸۶۸} ^{۸۶۹} ^{۸۷۰} ^{۸۷۱} ^{۸۷۲} ^{۸۷۳} ^{۸۷۴} ^{۸۷۵} ^{۸۷۶} ^{۸۷۷} ^{۸۷۸} ^{۸۷۹} ^{۸۸۰} ^{۸۸۱} ^{۸۸۲} ^{۸۸۳} ^{۸۸۴} ^{۸۸۵} ^{۸۸۶} ^{۸۸۷} ^{۸۸۸} ^{۸۸۹} ^{۸۹۰} ^{۸۹۱} ^{۸۹۲} ^{۸۹۳} ^{۸۹۴} ^{۸۹۵} ^{۸۹۶} ^{۸۹۷} ^{۸۹۸} ^{۸۹۹} ^{۹۰۰} ^{۹۰۱} ^{۹۰۲} ^{۹۰۳} ^{۹۰۴} ^{۹۰۵} ^{۹۰۶} ^{۹۰۷} ^{۹۰۸} ^{۹۰۹} ^{۹۱۰} ^{۹۱۱} ^{۹۱۲} ^{۹۱۳} ^{۹۱۴} ^{۹۱۵} ^{۹۱۶} ^{۹۱۷} ^{۹۱۸} ^{۹۱۹} ^{۹۲۰} ^{۹۲۱} ^{۹۲۲} ^{۹۲۳} ^{۹۲۴} ^{۹۲۵} ^{۹۲۶} ^{۹۲۷} ^{۹۲۸} ^{۹۲۹} ^{۹۳۰} ^{۹۳۱} ^{۹۳۲} ^{۹۳۳} ^{۹۳۴} ^{۹۳۵} ^{۹۳۶} ^{۹۳۷} ^{۹۳۸} ^{۹۳۹} ^{۹۴۰} ^{۹۴۱} ^{۹۴۲} ^{۹۴۳} ^{۹۴۴} ^{۹۴۵} ^{۹۴۶} ^{۹۴۷} ^{۹۴۸} ^{۹۴۹} ^{۹۵۰} ^{۹۵۱} ^{۹۵۲} ^{۹۵۳} ^{۹۵۴} ^{۹۵۵} ^{۹۵۶} ^{۹۵۷} ^{۹۵۸} ^{۹۵۹} ^{۹۶۰} ^{۹۶۱} ^{۹۶۲} ^{۹۶۳} ^{۹۶۴} ^{۹۶۵} ^{۹۶۶} ^{۹۶۷} ^{۹۶۸} ^{۹۶۹} ^{۹۷۰} ^{۹۷۱} ^{۹۷۲} ^{۹۷۳} ^{۹۷۴} ^{۹۷۵} ^{۹۷۶} ^{۹۷۷} ^{۹۷۸} ^{۹۷۹} ^{۹۸۰} ^{۹۸۱} ^{۹۸۲} ^{۹۸۳} ^{۹۸۴} ^{۹۸۵} ^{۹۸۶} ^{۹۸۷} ^{۹۸۸} ^۹

مارچ ۱۹۱۰ء

۳۱

برہان دہلی

ی ہڈی ٹوٹ گئی اس وقت بنگال اور کرناٹک کے خزانے ڈھل ڈھل کر
انگلیز پہنچ رہے تھے اور انہی خزانوں کی بدولت وہاں صنعتی انقلاب
روح پھوٹ رہا تھا۔ اور ہندوستان روز افزوں مفلس و قلاںس ہوتا جاتا
تھا۔ ہماری اس حالت زار کو شیخ غلام احمد مہدانی مصحفی امر دہوی
متوفی ۱۳۴۰ھ نے ایک شعر میں یوں واضح کیا ہے۔
ہندوستان کی دولت و حشمت جو کچھ کھتی
ظالم فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی
اور Subsidiary Alliance پر شیخ قلندر بخش جرات
متوفی ۱۲۲۵ھ جیسے غزل گو شاعر نے کہا ہے۔

کبھی نہ انہیں امیر اب اور نہ وزیر
انگریزوں کے ہاتھوں قفس میں ہیں اسیر
جو کچھ نہ پڑھا میں سو یہ منہ سے بولیں
بنگال کی مینا ہیں یہ پورب کے امیر
اور آج ارتقاء کی منزلیں بتدریج طے کرتی ہوئی اردو غزل اپنے
لغوی معنی اور خالص رنگ تغزل سے کتنی دور آگے پہنچ گئی
ہے۔

زندگی عارض و کاکل کی گزر گاہوں سے
بڑھتے بڑھتے رس و دار تک آ پہنچی ہے
دراصل شاعر کافن اور اس کا ذہنی سفر ذات و کائنات کی کشمکش
اور تخیلات کی وادیوں کا ایک ایسا زمیہ (منظر) اور ایک ایسا
دشت تمثیل ہے جس کی تفہیم کے لئے اس لمحہ سکوت و تحیر کی

ضرورت ہے جس میں ہر صورت خود اپنا مفہوم بن جاتی ہے۔ چنانچہ شاعری کا ہلکا خون دل سے سیراب اور سوزِ فکر سے منور ہوتا ہے، شاعری صرف لطف اندوزی کا نہیں بلکہ فطرتِ انسانی کی عقدہ کشائی کا ذریعہ ہے۔ اس کی آسانیاں مشکلیں اور اس کی مشکلیں آسانیاں پیدا کر دیتی ہیں۔ شاعری کیفیت کے ملکوں کی سیر ہے، صحرانوردی اور کوہ کنی ہے۔ تمناؤں کی تربیت اور تہذیب ہے، شاعری جنون کا سبق دے کر ہوش کے آداب سیکھاتی ہے، جذبات کو تہہ و بالا کر کے سکون کے نقشے بناتی ہے۔ اس کی مثبت پرخواہ اخلاقی اور روحانی مصالح ہوں یا نہ ہوں، کیونکہ یہ ایک آزاد انسان کی وارداتِ قلبی کے سوا کچھ نہیں مگر شاعر کی ذہنیت اس کے ادراکِ حقیقت پر غالب نہیں آتی چاہیے ہی شاعری کی آبرو اور جان ہے، اسی ادراکِ حقیقت کی ترجمانی کا واقع انکشاف غالب نے کیا ہے: ۷

وفاداری ہشکل استواری اصل ایمان ہے

مرے بُت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑھو برہمن کو

یعنی شاعر کے لیے انسان ہونا اور آگاہ ہونا اک دروِ بے درماں ہے:-

شکوہ و شکر کو ثمرِ بیم و امید کا سمجھ

خانہ آگہی خراب دل نہ سمجھ بلا سمجھ

آج غزل کا دائرہ نہایت وسیع ہو گیا ہے۔ جس میں زندگی کے ہر موضوع کو سمویا گیا ہے، زبان کے اعتبار سے بھی سادگی و صفائی کی طرف توجہ ہوئی اور پیچیدہ گجھلک اندازِ بیان متروک ہوا لہذا آج اس میں انسانی جذبات کی صاف ستھری تصویریں نظر آنے لگی ہیں عشق

ماہِ پچ ۹۱ء

۳۳

برائے دل

نصفِ یوہو اسی کے جذبات کا اظہار نہیں رہ گیا بلکہ اس کے مفہوم میں
وسعت پیدا ہوئی اور سیاسی نصب العین تنگ کے لیے عشق کا
استعارہ استعمال ہونے لگا ہے۔ پھر عشق کا غم انسانی دکھ درد کے
ساتھ اس طرح ہم آہنگ ہو گیا کہ غم جاناں اور غم دوراں میں کوئی
امتیاز باقی نہ رہا۔ غزل کے شاعر نے بھی زندگی کی حقیقتوں سے
آنکھیں ملائیں اور اُن کو اپنے ہاں جگہ دے کر غزل کی حقیقت
سے قریب تر کر دیا۔

زبانِ زندگی کو متاثر کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے اور زندگی کی
ترجمانی کا وسیلہ بھی، مگر اس کے لیے تنگ نظری سے گریز اور فراخ
دلی سے کام لینا لازم ہے۔ اس حیثیت سے اردو کی وسیع المشرقی
اور کشادہ دامانی پر اگر ہم ایک نظر ڈالیں تو اندازہ ہو گا کہ اس
کی فرسنگ مصطلحات میں عربی، فارسی، ترکی، سنسکرت، ہندی
انگریزی، فرانسیسی، پرتگالی و لاطینی اور ہمارے ملک کی تمام
مقامی و صوبائی زبانوں کے الفاظ ملیں گے۔ درحقیقت اردو
ادب اور شاعری کا بنیادی اصول یہ رہا ہے کہ ”خدا صفا دُع
ما کدُر“، یعنی اچھے کو اختیار کرو اور برے سے گریز۔

(ختم شد)